اینجانب

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

حضرت دنیا جہاں کے لوگ زبان کی مدح بھی کرتے ہیں۔ اور ذم بھی۔ یہی زبان بھلا مزا دے اور یہی بُرا مگر یہ تو بتلے جڑے جوان مردوں کی زبان کا حال ہے۔ بے زبان رنڈیوں اور عورتوں کی زبان کس طرح پر نہایت شیریں انہیں لوگوں کو معلوم ہوتی ہے جو فریفتہ ہوتے ہیں یا جن کو ان سے کسی طرح کا تعلق ہوتا ہے۔ ان کو گویا مزے کے مارے لٹتی ہے۔ ان کی تلخ بات بھی شیریں کہی جاتی ہے کہ

کمال ہوتی ہے ۔

وہ دشنام لبوں ہیں دیتے ہیں   مزے مجھے واسطے مزے لیتے ہیں
کسی سے اپنے ہی لوگوں کی زبانی کہا ہے ۔

وہ کچھ تو شیریں مجھے گالی مزا دے   ہاں وہ لفظ نہیں جو ترشی اتار دے

لیکن کس طرح بد بختی سے نہایت ہی تلخ ان لوگوں کو معلوم ہوتی ہے جو مجھے کہا سے زمانے سرد و گرم چشیدہ اور ان سے بے تعلق ہیں اور پھر ان کی نکلی ہوئی زبان۔ الہٰی توبہ۔ خدا دشمن کو بھی نہ کرے۔ جیسے نکلی ہوئی زبان ۔ ہاتھی کے دانتوں کی طرح ممکن نہیں کہ پھر اندر ہو سکے۔ یہ کسی ایسی کمبخت ہستی سے معلوم ہو سکتی ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ۔

ان ہوا اسطے مرد   کو بہ جہاں عالم است دوزخ است

مردوں اور رنڈیوں کی تو زبان کو کہا جاتا ہے کہ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے کو کسی کی نہیں۔ بعض اسکو کترنی کہتے ہیں۔ لیکن جو زبان ہاتھوں سے نیچے بھی لٹکے یا لغت ڈیڑھ لغت کی نکلے ۔ وہ زبان بھرے کی زہر بلکہ عجیب ہے اور عجیب ہی مرکب چڑے چڑیا کی سی۔ جس کی کہانی بچوں کی دادی نانا، بوجھو۔ وہ ۔ملائی ۔ داستان گو سے سنی جاتی ہے۔

کہ ایک تھا چڑا۔ اور ایک تھی چڑیا۔ چڑا لایا چاول کا دانہ اور چڑیا لائی مونگ کا دانہ دونوں نے مل کے کھچڑی پکائی۔ انجام کار کتا کھا گیا۔ بی سو گھو گئی کہیں ۔ کیا سمجھے ہو

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

خاصکر ہمارے شہر کے اہل زبان۔

خدا کی خدائی میں کیا ہو رہا ہے

حضرت سلامت ہو کیا رہا ہے۔ کھلیان ہو رہا ہے۔ کوئی یہ بھی سمجھے کہ اناج کا کھلیان ہو رہا ہے۔ شہر میں اناج کے کھلیان کا کیا واسطہ۔ اور دیہات میں بھی نہیں۔ اس لئے کہ بیچاری کے مزدور بھی فاقوں بیٹھے۔ اور مکا کا ٹوٹ ہو رہے ہیں۔ جوار، باجرہ۔ مکی۔ اڑد، مونگ۔ موٹھ۔ مٹر کا کون کھلیاں بنا کر آئندہ کے نادیکھے حضرت۔ آدمیوں کا کھلیان ہو رہا ہے۔ آدمیوں کو انگلوں کی اگلی مثل کہ شادی دعم تو ادھر ہے۔ عمر بڑھ ہو گئی۔ اس لئے کہ سیانا دادے دیو۔ دیو سے او دیہن کو کر دیتے ہے کے مار ہے تو عمر تھوڑی عمر رہ گیا ہے اور عمر بھی طرح طرح کا۔ کسیکو عوارض امراض کا۔ اور کسیکو دبائی اموات کا۔ کسیکو قحط و گرانی کا۔ کسیکو بیکاری کی پریشانی کا۔ کسیکو کائنات کے انہدام کا۔ کسیکو حوزہ و تونش صبح و شام کا۔ لیلائ غزلوں کا کیا فکر کا تا ہے ۔

کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

جاڑے کے دنوں میں اسی کا وٹہ بنا ولائی کا بچھ نا ہو گیا غریبوں کو گرمانے کے لئے کہ بھی تو میسر نہیں۔ جو سستا سا دیہی کرکھا کے کھا دو جو سب ایک ما جاڑے کی بھر بھری کرک تو کسی جو لٹے میں جلانے کی لکڑیاں بھی لکڑستان میں نہ دیں۔ آگ تاپ سکے بھی بسر نہیں کر سکتے۔ اس جا بیابانی کے بچی بیر ہے۔ جلا کے ایک دو دن کوئی گزر کرے۔ کئی سال سے گرانی ایسی نہیں ہو رہی ہے کہ کوئی کچھ دن تک اس کا غم کھا کے اس سے کہ اب ارزانی کی امید بھی نہیں رہی اب تو دن قبل ہو گا صدا دعا نا ہے گی۔ اینجانب قحط و گرانی سے ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ ہے آہستہ خرام بلکہ مخرام بدر قدمت ہزار جان است مگر دعا بے اثر رہی کا نتیجہ ہمارے حاجی منہ چڑھانے کو کردیا۔

یاران ہم قالب

اشرار بیٹھے پیچھے لگے کہنے یار سے

صرف عید سے مل آئے تھے بس آج اب چلے

ہمسی بیچ ہو سے - علیک سلیک کے بعد شکر و تسلیمات کی ضیو تیان مزاج مقدس کے کہہ رہے ہیں حاضر ہیں۔ ذرا اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سنبھال لیجئے۔ آہا ہا - آپ تشریف لایئے گلے سے لگ جایئے۔ حضرت مجھے اتنی فرصت نہیں۔ بس مجھ نہیں سکتا۔ کیونکہ بہت سے دوست مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ ان گلے ملنے اور رخصت دیجئے میں تو ابھی فوراً عید گاہ سے نماز پڑھ کر چلا آ رہا ہوں۔ دل میں یہ خیال ہوا کہ چلیے ذرا مولانا ولی اللہ سے مل چلیں۔ شاید پھر فرصت نہ ملے۔ اور سب یاروں سے پہلے ہی ہماری حاضری ہو جائے۔ اچھا تو اب رخصت۔ بندہ بشرط فرصت۔ اگر حضرت ذرا ٹھہرنا۔ ہمارے یاران ہم قالب خیال کریں گے۔ کہ دیکھئے حضرت الحق تشریف لائے ملنا تو درکنار۔ ہم لوگوں سے ذرا بیٹھا بیٹھا ملا بھی نہیں گیا۔ خیر چلیے اپنی تصنیف نہیں ہے تو اپنے دوست و احباب کی تو سہی۔ سنیے میں اپنے اخگر صاحب کی دیوالی کی غزل دیتا ہوں۔ ذرا اخبار سے یاروں کو ہماری طرف سے سنا دیجئے۔ انشاء اللہ خیر سلا ...

غزل جناب اخگر بہرائچی

ہے یہی میری زبان پہ ہائے دیوالی کی شب
دیکھئے پھر کب خدا دکھلائے دیوالی کی شب

ایک دو گھنٹہ رہا شامل مرے وہ شمع رو
رہ گئی دل ہی میں حسرت ہائے دیوالی کی شب

شب چراغوں پر جو ارض لیج کا عالم ہوا
جب کہ وہ کوٹھے پہ اپنے آئے دیوالی کی شب

دیکھ کر جلوہ میرے سینے لالہ رو کا ہر رقیب
داغ حسرت دل پہ اپنے کھائے دیوالی کی شب

اس بت سفاک سے مانی نہ اُن کی ایک بھی
جو کیا کیا غیر نے سکھلائے دیوالی کی شب

پان اس نے جب کھلایا دیکھ کر اغیار سب
رہ گئے بس خون پی کر ہائے دیوالی کی شب

یاد جب کرتے ہیں اخگر لطف دیوالی کا ہم
بس تڑپ جاتے ہیں کہہ کر ہائے دیوالی کی شب

بقلم - انبارا الحق عاشق

قابل رحم ہے اس شخص کی رسوائی بھی

پردہ در پردہ بھی کمبخت جو رسوا ہو جائے

نیرنگی دنیا کا دکھڑا سننے سے کچھ پانی ہو گیا۔ کہیں جدائی - کہیں کلال، کہیں جاڑا - کہیں بخار - کہیں مجلس - کہیں ہیضہ - کہیں طاعون - کہیں قتل - کہیں غارتگری - اگرچہ انہیں پر تعمیروں کا نام ادا نہیں ہو فلموں حالات کا ظہور دنیا پر کہا گیا ہے۔

پس کچھ ضرورت نہیں ہے کہ آج ہم بھی وہی پچھلے کل کی دردناک داستان گذری ہوئے دلکش فسانے - اور چھوٹے بچے کی سی عجیب و غریب دلگداز واقعات سے کے بیٹھیں۔ جس کو نہ کوئی نگاہ دے اور دلچسپی کی آنکھ سے دیکھے گا۔ اور نہ محبت کے دل سے پڑھے گا۔

اس سے کیوں نہ حضرت انسان نحیف و زار کی حالات زندگی پر ہم آنکھ ڈالیں جس سے بار بار دنیا کی سرسبزی اور شادابی رہتی ہے اور اگر چشم بصیرت ہو تو دنیا وا ایسے واقعات سے سبق بھی لے سکتے ہیں۔ کیا سبب ہے کہ دنیا کا آخر وقت ہے۔ اور کیونکہ زوال ہے کہ اس کے شباب کا زمانہ گذر گیا۔ مگر یہی آج دنیا پر دم ادا دوسرے کے طرح موجود نہیں ہے۔ کہ آج بھی ہر جگہ اور مذاق کے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ جس قسم کا آدمی جس کسی مطلوب ہو۔ فوراً سے پہلے موجود ہو سکتا ہے۔ پھر آسانی بھی دریافت کرنا چاہئے کہ وقت نہیں۔ اور بلا یہ چاہتے ہو۔ دشواری نہیں ہے۔

امیر - غریب - فقیر - عاقل - فاضل - جاہل - دیانت دار ...

دکھایا۔ جلک ناز۔ شکار۔ مغفرتی۔ جواری۔ قمار باز۔ حلال خور۔ دلال چلاک۔ دانشور۔ حکیم۔ حبیب۔ کاریگر۔ بیمار۔ عاشق کہاں تک نام گنائے جائیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر ہے کوئی اپنی جگہ پر خوش اور بشاش نہیں ہے۔ وہ دنیا ہر شخص کے لئے بند ہے۔ اور وقت طلب ایک دولتمند ہے۔ تو دولت کے ساتھ لاکھوں جھگڑے۔ ہزاروں افکار بھی کو اندر ہی اندر کھائے دیتے ہیں۔ ظاہر اجیرہ پر مصنوعی خوشی بطلب الحق ہے۔ مگر دل کو ہاتھوں سے سکے دیجئے۔ تو کچھ نام کو بھی نہیں ہے۔ وہ خون کا قطرہ اب کہاں رہا ہے۔ تو آنکھوں کے سیلاب سے بہا دیا ہے ہے

بہت شور سنتے تھے سینہ میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

دوسرے صاحب ہیں۔ انہیں بھی دولت کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہے۔ مگر پھر ان کا بھی جینا ہو رہا ہے۔ کیوں ؟ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہیں عشق کی آگ پھونکے دیتی ہے یہ ع

دلم شد خون و خون شد آب۔ آب از دیدہ بیرون شد

کی دھن میں ہیں۔ ایک آفت جان پر کار آتش۔ وہ زن۔ سنا قنار پر جان دئے بیٹھے ہیں۔ اگر کہیں ان کے آنکھ سے دیکھئے اور ان کی زبان سے اس کی تعریف سنئے تو آپ ہی عاشقوں کی فہرست میں نام درج کرا دیجئے۔

پھر طرہ یہ کہ بیمار سے جان۔ وہ عاشق ایسی جگہ پر جا کے سوئے ہیں۔ جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا ہے۔ بازاری مٹھائی نہیں ہے کہ نقد دام دے کر خریداری کر لیجئے۔ اس پر لطف یہ ہے کہ مال بھی اچھوتا اور نیا۔ رسائی دشواری سے خالی نہیں ہے۔ دوقنیں ہر طرف سے آغوش پھیلائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ جان دادہ ایسا پیچھے پڑا ہوا ہے کہ نہ دولت کی پرواہ کرتا ہے۔ نہ عزت ہی کے خیال کو پاس پھٹکنے دیتا ہے۔ اور اسی خیال میں پھنسا رہتا ہے کہ جان ہے۔ تو وصل بھی نصیب ہو جائے گا۔

تیسرے صاحب ہیں۔ انہیں بھی دولت کا تو پتا نہیں۔ مگر انہیں اولاد کی فکر مارے ڈالتی ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا ہے کہ دو چار فقیر ڈیوڑھی پر بیٹھے ہوئے گل خوانی نہ کر رہے ہوں اور کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا ہے کہ دو چار حکیم دروازہ پر آ کر دو چار نسخے نہ بتا جاتے ہوں۔ کوئی مہینہ نہیں گزرتا ہے۔ کہ ایک دو پنڈت یا درمال سے ساحت اور لگن نہ پوچھی جاتی ہو۔ غرض ان کی دولت فقیروں۔ حکیموں اور پنڈتوں کی قسمت کی ہے۔ مگر اولاد کی ہوس دبتی ہے۔ نہ بجھتی۔ بھولی معلوم ہوتی ہے۔ مزہ جو ہے اپنے آپ ایسی مجبور اور مستقل ہے۔

حافظ۔ ہر کس بخیال خویش خبطے دارد

بقلم۔ رفیع الدین الحکیم۔ دہلی

حضوری کے پڑوس میں ہیں تو ہیں

(بقیہ ہفتہ گزشتہ)

اور ان کی تو نہ پوچھئے۔ کہ بڑی ہوتے ہی شل ہو گڑ ہی کے پانی کے اوبل پڑے۔ پرانی باتوں کو کرم خوردہ تسلیم کر کے اپنے اصول بنائے۔ جیسے انگریزوں سے مس مائیکس ناولٹ۔ انہیں کیا مجال کہ یہ سمجھ جائے کہ کسی پہلی جڑی والے کے لڑکے ہوں گے۔ اور وہ لبغہ سے پرا ہوا۔ نوح کی پاک روح ان پر آئی ہو۔

غرض حقیقت تو یہ ہے۔ کہ انسان جب کسی بڑے شہر میں بے دقت ہو کر قدم رکھتا ہے۔ تو سینکڑوں پیر وکھڑے ہو جاتے ہیں۔ تمثیل کے لئے اسی کو دیکھئے تا۔ کہ جب تک ایڈورڈ محمدن لائبریری کا بیں بے دلی سے کام لیا گیا۔ بڑے فرد رہے رہی۔ پھر جب دو چار لیڈروں کو اپنے اپنے نفع کی سوجھی۔ لائبریری جان بحق تسلیم ہو گئی۔ پھر فی الحال۔ بجلی غالب کی تمثیل صادق آگئی۔ اور صرف سائن کا نام ہی نام رہ گیا۔ اب بتائیے۔ ایجانب کیونکر کہیں۔ کہ ہم خلوص بھی کو ہاتھ سے نہ دو نگے۔

بچنے نہ مجھے خدا کرے کوئی

ما فرد۔ دہلی شہر کے بابا آدم مسٹر گپ چپ

یا حیرت۔ اس بہار کے موسم میں اور پھر مجھ جیسا زندہ دل آدمی اور یوں بیکار رہے۔ ہم کو حیرت ہی کی بات ہے۔ موقع موقع سے بارش ہو رہی ہے۔ اور کسان خوش خوش کاشتکاری میں لگے

ہوگئے ہیں۔ جابجا محلوں میں جھولے ڈالے گئے ہیں۔ منگنیں بڑھ رہی ہیں۔ دوچار نگریا میں بیوی کی ٹوکریا۔ اب ساون بھیو سوکے رام رسنے ۔۔ کی دلکش تانیں کلیجہ برمائے ڈالتی ہیں۔ شاہجہان بازاری کی رنگین جانداں خواہ مخواہ خیالات میں رنگینی پیدا کر رہی ہیں۔ مگر میں ہوں۔ بلکل سے مس نہیں کرتا۔ وجہ کیا؟ وجہ یہ ہے کہ میں جس گھوسٹ تاب کے مکان میں رہتا ہوں۔ ان کی اماجان غلد آشیان وصیت کر گئی تھیں۔ کہ بیٹا نہ مکان کو مرمت کرانا۔ نہ گرنے دینا۔ اسی وصیت پر عمل ہو رہا ہے۔ کوٹھے کے کمرے کی دیواریں کمل کھلا رہی ہیں۔ کوئی دیوار۔ مالک مکان کے حال پر دانت نکالے ہنس رہی ہے۔ یا دانت پیس رہی ہے۔ غرض یہ کہ سارا مکان ہی شقاق المصری ہو رہا ہے۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ کہ اب یہ دیوار گری۔ اور اب وہ دیوار آ رہی۔ پھر ایسی صورت میں نہیں کہا کہ گھر چھوڑ کر کس طرح نکلوں اور کیونکر برسات کا لطف اٹھاؤں۔ اور کبھی ہمت کر کے گھر سے نکلا بھی تو منشی گنج کی سڑک نے قدم قدم پر یا علی کہہ کر سنبھلنا پڑتا ہے۔ شاید کسی کی دعائے نیم شبی نے اثر کیا۔ اب اس سڑک کی مرمت اور درستی روز بروز ہو رہی ہے۔ خدا کرے کسی روشنیال کے اثر سے لالٹینیں بھی لگ جائیں۔ یہی سب وجوہات ہیں۔ جو سارے لطف کو مٹا دیتے ہیں۔ چھاجھم پانی برستا ہے۔ اور میں تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہوں۔

کسانوں کا خیال ہے کہ اگر بارش کا یہی رنگ رہا۔ اور آخر تک اسیطرح بارش ہوتی رہی۔ تو امید ہے کہ فصل خوب ہوگی ؟

(واقعہ خیر۔ درمبنگوی از لکھنؤ)

کہ چٹ بیاہ پٹ موت

عام مثل تو یہ ہے کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ مگر عجب نہیں جو انقلاب زمانہ اور پے درپے حوادثات سے اس مثل میں بھی انقلاب ہو جائے اور بجائے "چٹ منگنی پٹ بیاہ" کے "چٹ بیاہ پٹ موت" ہو جائے۔ یوں تو ہر شخص جانتا ہے۔ کہ شادی و غم کا جوڑا ہے۔ بی شادی خانم بیوی ہیں اور میاں غم غلط خاں شوہر۔ جو ہمیشہ اپنی بیوی پر حاوی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ع اگرہے عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا

مگر خیر ان کا ظہور اپنے اپنے موقع سے ہو تو انسان ہر طرح سے بھگت لیتا ہے۔ مگر جب تک ناہنجار فلک بعض دفعہ ایسا بے موقع کر بیٹھتا ہے کہ جس پر غم کا پہاڑ ٹوٹے وہی شخص نہیں بلکہ سننے والے بھی کلیجہ تھام کر رہ جاتے ہیں۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جہاں خصوصیت کے ساتھ نشاط و عشرت کی محفل گرم ہوتی ہے وہی بزم ماتم ہو جاتی ہے۔ بقول حضرت داغ مرحوم ع

جہاں بجتے ہیں نقارے وہیں ماتم بھی ہوتے ہیں

چنانچہ پٹنہ میں بالکل اسی کے مطابق دو واقعے پیش آئے جنہوں نے قریب قریب تمام ہندو مسلمان کو سوگوار کر دیا۔ پٹنہ کے مشہور مارواڑی مالی رام کی لڑکی کا لگن۔ اور وہاں کے رئیس اعظم جناب منجھلے نواب صاحب کی صاحبزادی کی شادی ایک ہی زمانہ تھا۔ یعنی صرف ایک ہی دن کے آگے پیچھے کے فرق سے واقع ہوئی۔ دونوں دھن دولت کے دھنی۔ اور دونوں آن بان میں اپنی اپنی جگہ رئیس۔ صاحب ایک تو مسلمان۔ دوسرے خاندانی رئیس۔ جن کے اکلوتی لڑکی انہوں نے مالی رام کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی خرچ کر کے دولت بکھیرنی شروع کی۔ اور مالی رام کو جو کہنے کی مال نے ثابت کرنے کے لئے اپنی دولت کے جوہر کو اٹھے سیدھے خرچ کرنے شروع کر دیئے۔ جابجا صرف کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ غرض کہ دونوں شادیوں سے پٹنہ میں کئی ہفتہ تک چہل پہل رہی۔ اور دونوں کی عالی حوصلگی سے گھر گھر شادی کا عالم رہا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھیے کہ مالی رام کی لڑکی تو عین شادی کے روز گزر گئی۔ اور رخصت ہفتہ کے بعد نواب صاحب کی صاحبزادی بھی داغ مفارقت دے کر عشرت کدہ کو برسوں کے لئے ماتم کدہ بنا گئی۔

یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ دونوں کی موت ایک ہی بیماری یعنی فصلی بخار کے ذریعہ سے ہوئی۔ افسوس! سوائے صبر و شکر کے اور کیا چارہ ہے ؟

(راقم ایک پٹنہ والا)

استفہام

ہمارے منشی ظریف کب تک اگلے برس کی نیرہ تیز ہوں کی کھنکیاں سنیں ہیں سے جیب جاپ بیٹھے بیٹھی پھر تو نہ ہے بولا ہو سے کبیدہ گل بیٹھے ہیں۔ نہ ہی ذرا دل لگی ہے۔ سارا نہ ہو۔ اللہ جس طرح تو ادھر بھی دیکھو